ماہنامہ

چانن

مقامی حکومتوں میں کسانوں اور مزدوروں (عورتوں، مردوں) کی آواز

صرف ممبران کے لیے

ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ، پاکستان ۔ جلد 3 ۔ شمارہ 1-2 ۔ [illegible] ۔ جون-جولائی 2008ء

مینوں شاہی نئیں چاہیدی رب میرے
میں تے عزت دا ٹکر منگناں ہاں

فیض احمد فیض

ھمہ گیر تبدیلی
پہلا قدم ۔۔۔ زمینداروں کے شکنجے سے آزادی

ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ پاکستان نے جمہوری گورننس کے فروغ کے لیے شروع کیے گئے پروگرام کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے مختلف کیس سٹڈیز تحریر کیں۔ جن سے یہ ثابت ہوا کہ تنظیمی کاوشوں اور معمولی نوعیت کی مالی معاونت سے کسان مزدور عورتوں اور مردوں کی مشکلات بھری زندگیوں میں مثبت تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اس میں یہ پہلو بھی ابھر کر سامنے آیا کہ تنظیم سازی کے عمل سے صدیوں سے پچھڑے ہوئے افراد اتنے بااعتماد ہو جاتے ہیں کہ وہ زمینداروں/اجارہ داروں پر انحصار کی بجائے نہ صرف اپنے مسائل کے حل کی طرف پیش رفت کرتے ہیں، بلکہ ان میں عورتوں کے سماجی، معاشرتی اور معاشی کردار کو بھی قبول کرنے کا رجحان ابھرنے لگتا ہے۔ لہذا امید کی جا سکتی ہے کہ آہستہ آہستہ مردانہ سوچ کے حامل معاشرے میں عورتوں اور مردوں کو برابری کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ قارئین ہم چانن کے توسط سے یہ کیس سٹڈیز آپ کی نذر کریں گے۔ اس شمارے میں "پہلا قدم ۔۔۔ ھمہ گیر تبدیلی" شامل کی جا رہی ہے۔

میانوالی کا گاؤں نکال کبھی بڑا خوشحال ہوا کرتا تھا، جب یہاں مہاجر نہر اور اس سے نکلنے والے پانی کا چوڑا کھال "بھوکی برانچ" بہتا تھا اور یہاں کے کھیتوں کو سیراب کرتا تھا۔ اس وقت یہاں کا کسان معاشی طور پر بڑا آسودہ حال تھا۔ 50 سال قبل تک "بھوکی برانچ" کا پانی کسانوں کی زندگیوں کو حل تھل کرتا رہا۔ مگر اس کی دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے یہ اہم کھال ریت اور کیچڑ کے نالے میں تبدیل ہو گیا اور پھر ایک وقت آیا کہ یہاں سے پانی کا حصول ناممکن ہو گیا اور کسان بدحال ہونے لگے۔

مقامی کسانوں کے مطابق 1972ء کی زرعی اصلاحات کی وجہ سے یہاں کی 150 ایکڑ اراضی کو پانی دستیاب تھا جبکہ 300 ایکڑ زمین کے لئے پانی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ اراضی اپنی ملکیت میں رکھنے کے لیے جاگیرداروں نے "بھوکی برانچ" کو دانستہ اس حال تک پہنچایا"۔ کسانوں کی اس بات میں نہ جانے کتنی حقیقت اور کتنا افسانہ ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ 1972ء کی زرعی اصلاحات کے نتیجے میں وہاں بھیگراں کے بے زمین ہاری کو 5 ایکڑ اراضی ملی تھی۔ اس وقت تک "بھوکی برانچ" ایک ریتلا نالا بن چکی تھی۔ لہذا ملنے والی اس اراضی سے کسانوں کو کچھ خاص فائدہ نہ ہوا۔ انہوں نے سخت محنت کی، زمین ہموار کی، ان پر بیج بوئے اور پانی کے لیے بارش کا انتظار کرتے رہے جو کہ ایک غیر یقینی طریقہ آبپاشی رہا ہے۔ اور پھر وہی ہوا جو ملک بھر کے دوسرے غریب کسانوں کا مقدر رہا کہ اکثر بارشیں نہ ہوئیں، پیداوار نہ ملی اور کسان کی زندگی میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہ آسکی، لیکن وہاں بھیگراں کا کسان مایوس نہ ہوا۔ وہ آبپاشی کے مستقل ذرائع کی عدم موجودگی کے باوجود ہل چلاتا، زمین ہموار کرتا اور بیج بوتا رہا اور یہ ذمہ داریاں پوری کر کے کھیتوں کے معاملات عورتوں کے سپرد کر کے خود یا تو حصہ داری کی بنیاد پر زمینداروں کے کھیتوں میں کام کرنے لگا یا پھر قریب کے چھوٹے شہروں میں یومیہ اجرت پر کام کرنے لگا۔ کیونکہ اسے بہر حال اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ تو پالنا تھا۔

2005ء میں جب محکمہ آبپاشی نے "بھوکی برانچ" کی بحالی کا قدم اٹھایا تو وہاں بھیگراں کے کسانوں کو یہ گمان ہوا کہ شاید اب ان کی بدحالی کے دن ختم ہونے جا رہے ہیں اور ایک بار پھر ان کا گاؤں ہرا بھرا ہونے جا رہا ہے۔ جب انہوں نے مدتوں بعد وہاں بھیگراں کی "بھوکی برانچ" میں پانی دیکھا تو انہیں اپنی زندگیوں میں خوشگوار تبدیلیوں کا یقین سا ہونے لگا۔ محکمہ آبپاشی نے "بھوکی برانچ" کے لیے پانی چھوڑ دیا تاکہ کھیت سیراب ہوسکیں مگر ناپختہ کھالوں کی وجہ سے کچھ تو اس کی مٹی پانی جذب کرنے لگی اور کچھ اطراف میں بہہ گیا یوں 70 فیصد پانی ضائع ہو گیا اور کسان ہاتھ ملتے رہ گئے۔ دیگر علاقوں میں محکمہ آبپاشی نے ایک ایکڑ اراضی کو سیراب کرنے کے لیے صرف 12 منٹ مختص کیے تھے۔ مگر اس گاؤں کے مخصوص حالات کے پیش نظر محکمہ نے فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے فی ایکڑ اراضی کو پانی دینے کا وقت کچھ بڑھا دیا لیکن

اس رعایت کا بھی کسانوں کو کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ وہ اس وقت میں آدھا ایکڑ سے کچھ زیادہ ہی کاشت کر سکے جبکہ ان کے پاس پانچ پانچ ایکڑ اراضی تھی۔ محکمہ آبپاشی کے اس اقدام کا کچھ فرق پڑا تو وہ صرف اتنا کہ اب ان کے ایک ایکڑ رقبے کو پانی ملنے لگا تھا اور اس سے انہیں تھوڑی بہت فصل حاصل ہونے لگی تھی۔

وہاں بھیگراں میں سیپ پاکستان کی ساتھی تنظیم سانجھ ڈویلپمنٹ فاؤنڈیشن کافی عرصے سے کام کر رہی تھی۔ ایک بار گاؤں نکال کا کسان محمد قاسم اس تنظیم کے رکن خان محمد سے ملا۔ اس کا مقصد کچھ مالی مدد حاصل کرنا تھا کیونکہ اس کے خیال میں سیاسی وابستگی رکھنے والے کئی افراد مالی مفادات حاصل کر رہے تھے۔ جبکہ وہ اور اس کے ساتھی اس سے محروم تھے اور غربت کی چکی میں پستے جا رہے تھے۔ سانجھ ڈویلپمنٹ فاؤنڈیشن کے ساتھ کچھ اجلاسوں کے بعد محمد قاسم اور اس کے ساتھیوں کو تنظیم بنانے کی ترغیب ملی جو "نکال کسان کمیٹی" کے قیام کا نکتہ آغاز تھا۔ نکال کسان کمیٹی بن گئی لیکن شروع میں ہی اس کے ممبران کے

بقیہ صفحہ 8 پر

ضلع ہری پور
کسان مزدور تحریک کے ثمرات
ڈی نوٹیفکیشن آرڈر

رپورٹ: ضیاقت زمان

قارئین ۔ دسمبر 2007ء تا جنوری 2008ء کے شمارے میں صفحہ 4 پر "ضلع ہری پور کے غریب کسان حکومتی حکم نامہ برائے حصولِ اراضی" کے عنوان سے ایک تحریر شائع کی تھی۔ آج ہمیں یہ شائع کرتے ہوئے انتہائی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ حکومت نے کسانوں، سول سوسائٹی کے دباؤ کے نتیجے میں اپنا فیصلہ واپس لے لیا ہے:

اگست 2007ء کو وفاقی حکومت کی ڈیمانڈ پر صوبہ سرحد کی حکومت نے ضلع ہری پور میں حطار انڈسٹریل اسٹیٹ کے نزدیک 1800 کنال نہری زمین مقامی کسانوں کو اعتماد میں لیے بغیر حاصل کر لی تھی۔ مقامی کسان اپنے ذرائع پیداوار اور اثاثہ جات چھن جانے پر بے سروپا ہو گئے اور مختلف سیاسی جماعتوں اور راہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور اپنا دکھڑا سنایا لیکن بے سود۔

مایوسی کے اس عالم میں انہیں ایس ڈی وی (sustainable development vision) ہی امید کی کرن نظر آئی کیونکہ انہوں نے سن رکھا تھا کہ یہ تنظیم ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ پاکستان کے ساتھ مل کر "جمہوری گورننس کے فروغ کے منصوبے" پر ضلع ہری پور میں عمل درآمد کر رہی ہے۔ جس کا بنیادی مقصد ہی کسانوں مزدوروں کو منظم کرنا ہے۔ رابطہ پر ایس ڈی وی نے متاثرہ کسانوں اور دیگر افراد کو ساتھ شامل کر کے ریلی و پریس کانفرنس منعقد کی جس کی تفصیل پہلے شائع ہو چکی ہے۔ سول سوسائٹی، ایس ڈی وی کے ممبران اور کسان ضلعی اور صوبائی حکومت کی انتظامیہ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ انہی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ 16-01-2008 کو حاصل کی گئی زمین کے آرڈر کینسل کرتے ہوئے حکومت نے ڈی نوٹیفکیشن آرڈر جاری کرتے جس کی کاپی عکس چانن میں چھاپا جا رہا ہے، ہوئے جس کی ایک کاپی ایس ڈی وی کے آفس کو بھی بھجوائی گئی۔

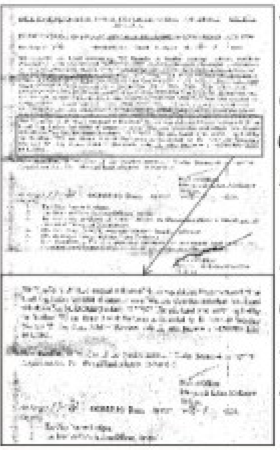

اس طرح مقامی کسانوں کی زمین ریاستی حکم نامے کے ذریعے چھننے سے بچ گئی اور کسانوں کا اعتماد بھی تنظیم سازی پر مزید پختہ ہو گیا۔ آج ہری پور کے کسان پہلے کی نسبت زیادہ منظم انداز میں اپنے مسائل کے حل کے لیے آواز بلند کر رہے ہیں۔

اداریہ — معاشی خوشحالی اور عدلیہ

اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کی غیر آئینی طور پر معزولی، مہنگائی اور دیگر لاتعداد مسائل میں گھری ہوئی پاکستانی قوم آج گومگو کی سی حالت میں ہے۔ لوگوں کو ہر پل ایک ہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے آنے والا پل کیا خوفناکیاں لے کر آئے گا۔

جدید معاشرے اپنے استحکام کے لیے پانچ بنیادی عناصر یعنی مقننہ، انتظامیہ، عدلیہ، ذرائع ابلاغ اور جمہوریت کو فروغ دینے والی سیاسی پارٹیوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ قارئین جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مقننہ کا دائرہ کار صرف قانون سازی تک محدود ہوتا ہے اور انتظامیہ نے ان پر عمل درآمد کروانا ہوتا ہے۔ تاہم بدقسمتی سے ہمارے ملک کی انتظامیہ بدعنوانیوں اور پرتشدد کارروائیوں میں ملوث ہے۔ ایسے حالات میں آزاد منش، بے خوف اور قابل افراد پر مشتمل عدلیہ ہی لوگوں کو انصاف فراہم کر سکتی ہے۔ آج کے حالات میں عدلیہ کے بارے میں جتنا سوچتے جائیں، اسکی اہمیت اور بھی بڑھتی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت ہر شخص ذخیرہ اندوزی اور سمگلنگ کی وجہ سے گندم کے بحران کا بھی شکار ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ آج اگر ہماری عدلیہ آزاد ہوتی، خاص طور پر جناب چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری اگر مسند انصاف پر تشریف فرما ہوتے تو اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے بہت پڑھا لکھا ہونے کی ضرورت نہیں کہ اب تک کئی ذمہ دار لوگ کٹہرے میں آ چکے ہوتے۔

پاکستان میں ایک اور اہم مسئلہ اربوں روپے کے قرضوں کا ہڑپ کیا جانا ہے۔ غریبوں کا خون چوس کر اکٹھے کیے گئے قرض اگر نہ ڈوبتے تو یقیناً اس رقم سے غریبوں کی آہوں اور سسکیوں میں کچھ فرق پڑ سکتا تھا۔ ہمارے وزیر خزانہ نے کچھ دنوں پہلے انکشاف کیا کہ پچھلے 8 سالوں میں "قرضہ مافیا" نے قومی بنکوں سے 60 ارب یعنی چھ ہزار کروڑ کے قرضے معاف کروائے ہیں۔ اسکے ساتھ ساتھ تقریباً 1500 ارب کی بدعنوانیاں سامنے آئی ہیں جن میں سابقہ وزیر اعظم شوکت عزیز کا کردار بھی اہم ہے۔ ہماری پہلی خاتون گورنر سٹیٹ بنک کا کہنا ہے کہ ارکان اسمبلی انہیں دھمکیاں دیتے ہیں۔ خود کو غیر آئینی طور پر مسلط کرنے والے صدر مملکت نے ایک موقع پر صحافیوں سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان "بنانا ریپبلک" نہیں ہے۔ بھلا ان سے کوئی یہ پوچھے کہ جس ملک میں چیف جسٹس کو دھکے مارے جاتے ہوں، اسکے بال نوچے جاتے ہوں، جہاں 50 سے زائد جج بیوی بچوں سمیت گھروں میں بند کر دیے جائیں، جہاں لوگ راتوں رات غائب کر دیے جائیں، جسکے گورنر سٹیٹ بنک کو دھمکیاں ملتی ہوں، جہاں ہر گھنٹے بعد اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہو، جہاں مقامی طالبان دکانوں اور حجاموں کو بم مارتے پھریں، جسے افغانستان جیسا ملک حملے کی دھمکی دے (کیوں کہ اسکا بیڑہ غرق کرنے میں پاکستان نے یقیناً کردار ادا کیا ہے) اسے بنانا ریپبلک نہ کہیں تو کیا کہیں؟

ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں پاکستان کی سیاسی قیادت کے لیے بے پناہ چیلنج ہیں۔ اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ ہر پانچ سات سال بعد کوئی جرنیل ملک کا ستیاناس کرتا ہے اور سیاسی پارٹیاں اس عمل میں بلاواسطہ یا بالواسطہ حصہ بنتی رہتی ہیں۔ لیکن اس بار جو چیز ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ملک کے طول و عرض میں اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ فوج کو ملک کی سرحد پار جانا ہوگا، سیاسی پارٹیوں کو اپنی تمام مہم جوئی کرنے والوں کا راستہ روکنا ہوگا (اسکے لیے آرٹیکل 6 کا استعمال ضروری ہے)، عدلیہ کو بحال کرنا ہوگا اور تمام پڑوسی ممالک سے تعلقات کو پرامن معاہدات کے ذریعے کرنا ہوگا۔

عدلیہ کا ایشو سارے بکھیڑے میں یقیناً بنیادی نوعیت کا ہے۔ کچھ قائدین کا فرمانا ہے کہ 2 نومبر والی عدلیہ سے بڑے مسئلے مہنگائی، بجلی کا بحران، لاقانونیت ہیں لہذا فی الحال وہ اس پر غور کر رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے۔ اگر این آر او دو تین ہفتوں میں سب کو ملزم سے بے گناہ قرار دے سکتا ہے تو اس سے کم عرصے میں عدلیہ بھی بحال ہو سکتی ہے۔ باقی رہا مہنگائی، بجلی کا بحران اور لاقانونیت تو یہ کام کرنے سے آئین، چیف جسٹس افتخار اسکے رفقائے کار، وکلاء، سول سوسائٹی اور میڈیا قطعاً نہیں روکتے۔

ہماری دعا ہے کہ پاکستان اور اس کی عوام کو بحران سے نکالنے میں ہماری سیاسی قیادت سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے کام لے ورگرنہ اب ہمارے پاس کوئی بے نظیر نہیں ہے۔ نواز شریف صاحب یقیناً لوگوں کی نبض کو سمجھ گئے ہیں۔ دوسرے سیاستدان بھی سمجھ جائیں تو ملک اور جمہوریت کے لیے اچھا ہے۔

غذائی اجناس کی عالمی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ وجوہات کیا ہیں؟

گلوبل وارمنگ، امریکی معیشت کی زبوں حالی، امریکی انتخابات اور تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتیں وہ ایشوز ہیں۔ جن پر عالمی برادری کی توجہ مرکوز ہے۔ لیکن اب غذائی اشیاء کی قلت اور بین الاقوامی سطح پر ان کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی شکل میں ایک نیا بحران ظہور پذیر ہو رہا ہے جس نے عالمی برادری کو تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ عالمی بینک کے مطابق پچھلے تین برسوں میں گندم، چاول، مکئی، سویابین سمیت دیگر اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں مجموعی طور پر 83 فی صد اضافہ ہوا ہے۔ خاص طور پر پچھلے چند ماہ سے غذائی اجناس کے عالمی نرخ بے حد تیزی سے بڑھے ہیں۔ اقوام متحدہ کے ادارہ برائے خوراک و زراعت (FAO) کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق جنوری تا مارچ 2008ء کے درمیان گندم کی قیمتوں میں 117.6 فیصد، چاول کے نرخوں میں 55.4 فیصد، مکئی 28.7 فیصد، پام آئل 84.2 فیصد، سن فلاور آئل 159.4 فیصد اور سویابین آئل 89.6 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اسی عرصے میں اسٹیل کی قیمتیں بھی 42 فیصد تک بڑھی ہیں۔ اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں ہوشربا اضافے کے پیش نظر بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (IMF) خبردار کر چکا ہے کہ اگر غذائی اجناس کی قیمتوں میں اضافے کا سلسلہ جاری رہا تو لاکھوں لوگ فاقہ کشی پر مجبور ہو جائیں گے اور خوراک کے اس بحران کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے چینی کسی جنگ کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ چند روز قبل عالمی بینک کے سربراہ رابرٹ زوئلک بھی یہ کہہ چکے ہیں کہ "اشیائے خورد و نوش کی بڑھتی ہوئی قیمتیں دس کروڑ افراد کو فاقہ کشی پر مجبور کر سکتی ہیں"۔ عالمی بینک کے مختلف اداروں کی جانب سے حال ہی میں جاری کی جانے والی رپورٹ میں پاکستان کو بھی ان 36 ممالک کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے جہاں خوراک کے شدید بحران کا خطرہ موجود ہے۔ غذائی اجناس کے نرخوں میں مسلسل اضافے کے اثرات ترقی پذیر ممالک میں عوامی احتجاج اور ہنگاموں کی شکل میں نظر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ افریقی ملک کیمرون میں اشیائے خورد و نوش کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے خلاف ہونے والے احتجاج اور ہنگاموں میں صرف فروری میں 40 افراد ہلاک ہو گئے۔ گذشتہ ہفتے لاطینی امریکہ کے غریب ترین ملک ہیٹی کے دارالحکومت میں ہونے والے احتجاجی مظاہروں کے دوران 5 افراد اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے جو گندم، چاول، سویابین اور تیل کے نرخوں میں اضافے کے خلاف اپنے جذبات کا پرتشدد اظہار کر رہے تھے۔ مصر میں بھی ایک سال میں غذائی اشیاء کی قیمتیں دوگنی ہو جانے کے خلاف دو روز تک فسادات کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی طرح انڈونیشیا، فلپائن، آئیوری کوسٹ، موزمبیق، سینیگال، بولیویا، ایتھوپیا اور مڈغاسکر میں بھی اشیائے خورد و نوش کے مہنگا ہونے کے خلاف عوام کی جانب سے احتجاج کیا جا رہا ہے۔ تھائی لینڈ اور پاکستان میں غذائی اجناس کی اسمگلنگ روکنے کے لئے فوج کی مدد لی جا رہی ہے خوراک کے ممکنہ عالمی بحران کے پیش نظر بھارت، ویتنام اور مصر نے چاول کی برآمد پر پابندی لگا دی ہے۔ جس کی وجہ سے بنگلہ دیش، فلپائن اور افغانستان جیسے چاول کے بڑے درآمد کنندگان میں صورت حال مزید خراب ہو گئی ہے۔

اب ایک نظر ان عوامل پر ڈالتے ہیں جو اشیائے خورد و نوش کے نرخوں میں ہوشربا اضافے کے ذمہ دار ہیں۔ عالمی اقتصادی ماہرین بائیو فیول کو غذائی اجناس کے مہنگا ہونے کا اہم ترین سبب قرار دے رہے ہیں۔ بائیو فیول کی تقریباً تمام پیداوار امریکہ، یورپ اور کینیڈا میں ہوتی ہے۔ ان ممالک میں کسانوں کو ان فصلوں کی کاشت کی جانب راغب کرنے کے لئے سرکاری اور نجی سطح پر بے حد کام کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے جن سے بائیو فیول تیار کیا جاتا ہے۔ بائیو فیول بنانے کی فیکٹریاں کسانوں کو ان کی فصلوں کی مارکیٹ کے مقابلے میں زیادہ قیمت دے رہی ہیں اس لئے ان ممالک میں مکئی اور گنے کی کاشت میں اضافہ ہو رہا ہے جب کہ کسانوں میں گندم، چاول اور دیگر غذائی اجناس کاشت کرنے کے رجحان میں کمی آ رہی ہے۔ اسی رجحان کی وجہ سے نہ صرف گندم اور چاول کی عالمی پیداوار میں کمی آئی ہے بلکہ ان کی قیمتیں بھی بلند ترین سطح پر پہنچ گئی ہیں۔ خوراک کے عالمی بحران کے خطرے کے باوجود امریکہ کے صدارتی انتخابات کی مہم میں ڈیموکریٹک امیدوار کہہ رہے ہیں کہ وہ بائیو فیول کی پیداوار بڑھانے کے لئے امداد میں اضافہ کریں گے۔ کینیڈا میں بھی کچھ اسی قسم کی صورت حال ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی طرح اب ترقی پذیر ملکوں میں بھی بائیو فیول کی تیاری کے منصوبے شروع کیے جا رہے ہیں۔ فلپائن میں، جہاں عوام چاول کی قیمتیں بڑھنے کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں، حکومت نے حال ہی میں بائیو فیول کی پیداوار کا آغاز کرنے کے لئے "بائیو فیولز ایکٹ" کی منظوری دی ہے۔ تیل کے بڑھتے ہوئے نرخ بھی غذائی اجناس کی قیمتوں میں اضافے کا اہم سبب ہیں، تیل کی قیمتیں سو ڈالر فی بیرل سے بھی تجاوز کر چکی ہیں۔ جس کی وجہ سے نہ صرف بجلی مہنگی ہوئی ہے بلکہ کھاد اور زرعی مشینری کے نرخ بڑھنے کے ساتھ ساتھ فصل کی کٹائی، اسٹوریج اور نقل و حمل پر آنے والی لاگت بھی بڑھی ہے۔ جس کا نتیجہ اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں اضافے کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ چین اور بھارت جیسے ممالک میں جو تیزی سے معاشی ترقی کی منزل طے کر رہے ہیں، وہاں لوگوں کی قوت خرید بڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے گوشت ان کی روزمرہ خوراک میں لازمی عنصر کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ان ممالک میں گوشت کی بڑھتی ہوئی طلب بھی غذائی اشیاء میں مہنگائی کی ایک بڑی وجہ ہے دنیا کے مختلف خطوں جیسے آسٹریلیا میں خشک سالی کے باعث فصلوں کی پیداوار متاثر ہوئی ہے۔ آسٹریلیا امریکہ کے بعد گندم برآمد کرنے والا دوسرا بڑا ملک ہے۔ رواں سیزن میں خشک سالی کی وجہ سے آسٹریلیا میں گندم کی 30 فیصد کم پیداوار ہوئی ہے۔ جس نے گندم اور اس سے بنائی جانے والی اشیائے خوراک کی قیمتوں میں مزید اضافہ کیا ہے۔ عالمی آبادی میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اسی رفتار سے غذائی اجناس کی طلب بڑھ رہی ہے۔ اس بڑھتی طلب کو پورا کرنے کے لئے زرعی شعبے میں سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سیکٹر میں سرمایہ کاری کا حجم بڑھنے کے بجائے کم ہوتا جا رہا ہے جس نے غذائی اشیاء کی موجودہ گرانی میں اضافہ کیا ہے۔ ان تمام عوامل کے پیش نظر یہ آسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غذائی اجناس کی قیمتوں میں اضافے کا رجحان عارضی نہیں ہے بلکہ کئی برس تک برقرار رہ سکتا ہے۔ خوراک کے عالمی بحران سے نمٹنے کے اقدام کے طور پر ورلڈ بینک کے صدر نے امیر ممالک پر زور دیا ہے کہ وہ خوراک کے عالمی پروگرام کے لئے فوری طور پر 500 ملین ڈالر فراہم کریں۔ دولت مند ممالک کی جانب سے مذکورہ رقم کی فراہمی کے بعد بھی صورت حال میں فوری بہتری کی امید نہیں کی جا سکتی، کیوں کہ جب تک خوراک کے بحران کی وجوہات کا سدباب نہیں کیا جاتا غذائی اشیاء کی قلت اور ان کی قیمتوں میں اضافے کا رجحان برقرار رہے گا۔

بشکریہ: اردن نیوز شمارہ 5 (روزنامہ ایکسپریس)

محنت کشوں کی نذر

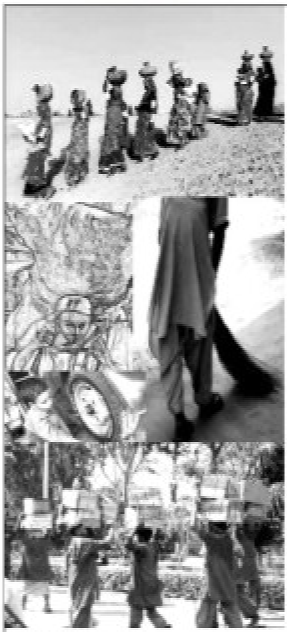

یہ پوچھتے ہیں کہ اے روشنی کہاں ہے تو
کسی کرن کسی سورج کی ایک ضو کیلئے
یہ روز گھر سے نکلتے ہیں نانِ جو کیلئے
یہ لے کے آتے ہیں اجرت میں روشنی اتنی
گھروں کا جس سے اندھیرا نمایاں ہوتا ہے
تھکے ہوئے یہ بدن اور پھٹے ہوئے یہ لباس
ہے جن کے ہونٹوں پہ چسپاں خموشی افلاس
لکیر ماتھے پہ جن کے ہے بدنصیبی کی
ہے جن کی راہوں میں تلخ و سیاہ تاریکی
کوئی زمین ہے پاؤں تلے نہ سر پہ فلک
نہیں ہے جن کی نگاہوں میں دور دور تلک
کوئی امید کی منزل کوئی یقین کا خواب
رہوں میں حد نظر تک بچھے ہوئے ہیں سراب
نہ جانے ان کے مقدر کو کون بدلے گا
گھروں میں جن کے ابھی زندگی نہیں اتری

از: ف۔ح۔ افسر منہاس

مشکل الفاظ: ضو۔۔۔۔روشنی، نانِ جو۔۔۔۔جو کی روٹی، سراب۔۔۔دھوکا

شراکتی نہری نظام سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوگا

لاہور: شراکتی نہری نظام کسان دوست اور زرعی پیداوار میں اضافہ کے لئے سنگ میل ثابت ہوگا۔ نہری نظام میں ادارہ جاتی اصلاحات کے عمل سے افسر شاہی کا خاتمہ ہوا اور ملکی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسان تنظیموں کو نہریں چلانے کے لئے بااختیار بنایا گیا ہے۔ یہ بات سابق پرنسپل لاء کالج پنجاب یونیورسٹی، کنسلٹنٹ پیڈا (PEDA) ڈاکٹر دل محمد نے ایریا واٹر بورڈ ایل بی سی (ایسٹ) کے ممبران کی ایک تربیتی ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا شراکتی نہری نظام دنیا کے دیگر ممالک ترکی، میکسیکو، فلپائن انڈیا اور جاپان سے زیادہ مضبوط ہے۔ کسان تنظیموں کو ایکسین کی سطح کے تمام اختیارات منتقل کرنے سے انہیں اپنے فیصلے خود کرنے کا پلیٹ فارم مہیا کیا گیا ہے جس سے کاشتکاروں کے مسائل میں کمی آئے گی۔

کنسلٹنٹ ریونیو چوہدری محمد شفیع نے ایریا واٹر بورڈ کی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ایریا واٹر بورڈ 19 ممبران پر مشتمل ہے جس میں 10 کسان اور 9 غیر کسان ممبرز ہیں۔ اس نئے نظام کی خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہر سطح پر کسانوں کی نمائندگی کی تعداد زیادہ ہے جن کا کام نہروں کی نگرانی و دیکھ بھال، پانی کی منصفانہ تقسیم اور پانی کی چوری کی روک تھام کے علاوہ آبیانہ کی بروقت وصولی کے علاوہ کسانوں کے باہمی تنازعات کے خاتمے کے لئے مناسب اقدامات کرنا ہے۔ سیکرٹری پیڈا چوہدری محمد شفیع نے ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ایریا واٹر بورڈ کا کردار ایڈوائزری ہے اور اس کے ممبران کو ہر سرکل کی سطح پر نئے نہری نظام کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرنا ہے تاکہ نظام میں مزید بہتری لائی جا سکے۔

بشکریہ: آج کل

سیاست و قیمتیں

60 سالہ سیاست اور قیمتوں میں کیا کیا اتار چڑھاؤ آتا رہا

سال	1947-51	1951-53	1958-69	1972-77	1977-88	1988-90	1990-93	1993-96	1997-99	1999-08	2008 تا
لیڈر	لیاقت علی خان	خواجہ ناظم الدین	جنرل ایوب خان	ذوالفقار علی بھٹو	جنرل ضیاء الحق	بے نظیر بھٹو	محمد نواز شریف	بے نظیر بھٹو	محمد نواز شریف	پرویز مشرف	یوسف رضا گیلانی
قیمت فی کلو (آٹا)	20 پیسے	25 پیسے	50 پیسے	ایک روپیہ	2.50 روپے	3.25 روپے	4/2.50 روپے	6.60 روپے	8.00 روپے	17.00 روپے	22.00 روپے
1947 سے اضافہ		0.05 پیسے	25 پیسے	80 پیسے	2.30 روپے	3.05 روپے	4.05 روپے	6.40 روپے	7.80 روپے	16.80 روپے	
دور اقتدار میں فی صد اضافہ		25%	100%	100%	151%	30%	35%	55%	21%	112%	
سالانہ اضافہ (فی صد)		8%	10%	14%	14%	15%	12%	18.33%	10.5%	10.2%	
1947 سے اضافہ (فیصد)		25%	250%	400%	1150%	1525%	2075%	3300%	4000%	8500%	
قیمت فی کلو (چینی)	60 پیسے	75 پیسے	1.75 روپے	6 روپے	9 روپے	10 روپے	13 روپے	21 روپے	21 روپے	30 روپے	25.00 روپے
1947 سے اضافہ		15 پیسے	1.15 روپے	5.40 روپے	8.40 روپے	9.40 روپے	12.40 روپے	20.40 روپے	20.40 روپے	29.40 روپے	
دور اقتدار میں فی صد اضافہ		25%	133%	240%	50%	11%	13%	61%	صفر%	43%	
سالانہ اضافہ (فی صد)		8%	12%	34%	4.50%	6%	12%	20%	صفر%	4%	
1947 سے اضافہ (فیصد)		25%	190%	900%	1400%	1565%	2065%	3500%	3500%	5000%	
قیمت فی کلو (گھی)	2.50 پیسے	3 روپے	5 روپے	9 روپے	15 روپے	20 روپے	32 روپے	48 روپے	48 روپے	135 روپے	140 روپے
1947 سے اضافہ		50 پیسے	2.50 روپے	6.50 روپے	1.50 روپے	17.50 روپے	29.50 روپے	45.50 روپے	45.50 روپے	132.50 روپے	
دور اقتدار میں فی صد اضافہ		20%	66%	80%	66%	33%	60%	50%	صفر%	181%	
سالانہ اضافہ (فی صد)		7%	6%	11%	6%	18%	24%	16%	صفر%	16.4%	
1947 سے اضافہ (فیصد)		20%	100%	260%	500%	700%	1180%	1920%	1920%	5400%	
قیمت فی کلو (دال چنا)	25 پیسے	35 پیسے	1.50 روپے	2.50 روپے	9 روپے	10 روپے	18 روپے	18 روپے	20 روپے	42 روپے	48 روپے
1947 سے اضافہ		10 پیسے	1.25 روپے	2.25 روپے	6.75 روپے	9.75 روپے	17.75 روپے	17.75 روپے	19.75 روپے	41.75 روپے	
دور اقتدار میں فی صد اضافہ		40%	328%	66%	260%	11%	80%	0%	11%	110%	
سالانہ اضافہ (فی صد)		13%	29%	9%	23%	6%	32%	0%	5.5%	10%	
1947 سے اضافہ (فیصد)		40%	500%	900%	3500%	3900%	7100%	7100%	8000%	16800%	
قیمت فی کلو (گوشت)	10.25 روپے	1.75 روپے	12 روپے	16 روپے	40 روپے	50 روپے	80 روپے	110 روپے	110 روپے	285 روپے	285 روپے
1947 سے اضافہ		50 پیسے	10.75 روپے	14.74 روپے	38.75 روپے	48.75 روپے	78.75 روپے	83.75 روپے	108.75 روپے	283.75 روپے	
دور اقتدار میں فی صد اضافہ		40%	685%	33%	150%	25%	60%	37%	صفر%	159%	
سالانہ اضافہ (فی صد)		13%	53%	5%	14%	12%	24%	12.50%	صفر%	14.4%	
1947 سے اضافہ (فیصد)		40%	660%	1160%	3100%	3900%	6300%	6800%	6800%	22800%	
قیمت فی لٹر (پٹرول)	15 پیسے	0.35 پیسے	2.75 روپے	3.45 روپے	7.75 روپے	12 روپے	14 روپے	18.55 روپے	27 روپے	62 روپے	68 روپے
1947 سے اضافہ		0.20 پیسے	2.60 روپے	3.30 روپے	7.60 روپے	11.85 روپے	13.85 روپے	18.40 روپے	26.85 روپے	61.85 روپے	
دور اقتدار میں فی صد اضافہ		130%	685%	25%	124%	55%	17%	32%	45.5%	129.6%	
سالانہ اضافہ (فی صد)		42%	62%	4%	12%	30%	17%	11%	22.7%	11.78%	
1947 سے اضافہ (فیصد)		130%	1733%	2200%	5066%	7900%	9300%	12366%	18000%	41333%	

بشکریہ: نوائے وقت 5 اپریل، 2008ء

زرعی مارکیٹنگ اور کسانوں کی مشکلات

کسان کی ناگفتہ بہ حالت میں جہاں بہت سے دیگر عوامل کارفرما ہیں وہاں زرعی اجناس کی مارکیٹنگ انتہائی اہمیت کا حامل مسئلہ ہے۔ اس ضمن میں سب سے اہم مسئلہ زرعی اجناس کی قیمتوں پر حکومتی کنٹرول جبکہ زرعی مداخل کی قیمتوں پر عدم کنٹرول ہے۔ زرعی مداخل کی قیمتوں پر عالمی کمپنیوں کے کنٹرول کے باعث ان پٹس اور آؤٹ پٹس کا توازن بری طرح بگڑ گیا ہے، ستم بالائے ستم یہ کہ زرعی مداخل کے نرخ تو عالمی مارکیٹ کے مطابق طے کئے جاتے ہیں جبکہ زرعی اجناس کی قیمتیں حکومت طے کرتی ہے جو کسانوں کی رائے، تجاویز اور خواہشات کے بالکل برعکس ہیں نتیجتاً زرعی مداخل کسان کی قوت خرید سے باہر ہوگئے ہیں جس کی وجہ سے کسان کے لئے جسم و روح کا رشتہ برقرار رکھنا مشکل ہوگیا ہے۔

اس حوالے سے مڈل مین یعنی آڑھتی کا کردار بہت ظالمانہ ہے جو محض پیسے کی بنیاد پر کسان کا استحصال کر رہا ہے۔ آڑھتی پول کر کے اجناس کے دام کم کر دیتے ہیں جبکہ کسان کو مختلف قسم کے قرض چکانے اور دیگر بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے مجبوراً آڑھتی کے من پسند نرخوں پر اپنی جنس فروخت کرنا پڑتی ہے۔ کسان کے پاس مناسب اور بنیادی سہولیات کی عدم دستیابی کے باعث فصل کو مارکیٹ میں فروخت کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہوتا اور اگر مارکیٹ میں نرخ کم ہونے کی وجہ سے وہ اپنی اجناس فروخت نہیں کرتا تو حکومت دفعہ 144 نافذ کر کے اسے اپنی اجناس ذخیرہ کرنے سے روک دیتی ہے اور اسے اپنے طے شدہ نرخوں پر جنس فروخت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ کسان کو زرعی مارکیٹنگ کی لاعلمی کی وجہ سے بھی بہت سی محرومیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مارکیٹنگ زرعی شعبے کا ایک اہم جزو ہے کیونکہ درست مارکیٹنگ کاشتکاروں کے لئے بہتر معاشی فائدے کو یقینی بنا سکتی ہے۔ منڈی کی غیر یقینی صورتحال بھی تجارتی بدعنوانی کا باعث بنتی ہے۔ اس کا شکار کسان اور صارفین دونوں بنتے ہیں۔ تکنیکی علم سے آراستہ کسان، جنہیں یہ علم ہو کہ مختلف زرعی مداخل کی کھیت میں استعمال کی نوعیت، وقت اور مقدار کیا ہو؟ اپنی موجودہ حالت کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

بدقسمتی سے کسان کو مارکیٹ کے بھاؤ کے اتار چڑھاؤ کا بھی علم نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ عملاً مارکیٹ کی قوتوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ کسان آگاہ ہوں تو پیداوار کو صارفین تک پہنچانے کے ذمہ داروں یعنی سرکاری اہلکاروں، پٹواریوں، ٹیکس اکٹھا کرنے والے عملے اور آڑھتیوں پر انحصار کئے بغیر اپنے زرعی مسائل خود حل کر سکتے ہیں۔ کسان سے پیداوار لے کر صارفین تک پہنچانے کے ذمہ دار یہ عناصر اس عمل میں مشکل سے کمائی گئی کسانوں کی آمدن کا بڑا حصہ ہضم کر جاتے ہیں۔

مجموعی ملکی پیداوار (جی ڈی پی) میں زرعی شعبے کا حصہ 25 فیصد ہے جس پر ملک کی 80 فیصد آبادی کا انحصار ہے۔ اس لئے آئی ایم ایف کی شرائط کو رد کرتے ہوئے اس شعبے کو سرکاری سرپرستی کی شدید ضرورت ہے کیونکہ اگر کسان کو اس کی فصل کی درست قیمت نہیں ملتی تو زرعی اجناس کی پیداوار میں تیزی سے کمی واقع ہوگی۔ بھارت اور امریکہ کی طرح پاکستان کو بھی اپنے زرعی شعبے کی برآمدی صلاحیت سے فائدہ اٹھانے کے لئے کاٹن ٹیکسٹائل اور چاول کو سبسڈی دینی چاہئے۔

بعض حالات میں بھارتی کسانوں کو زرعی اجناس پر 50 فیصد تک سبسڈی اور ٹیکس میں چھوٹ ملتی ہے۔ بھارت میں 150 ایکڑ زرعی رقبے کے لئے ایک ٹریکٹر ہوتا ہے جبکہ پاکستان میں یہ تناسب 225 ایکڑ کے لئے ایک ٹریکٹر کا ہے۔ اس کی بڑی وجہ پاکستانی حکومت کا عالمی مالیاتی اداروں کی غلامی کرنا ہے جو زراعت پر سبسڈی نہ دینے کی شرائط عائد کرتے ہیں۔ انہی شرائط کے باعث پاکستانی زراعت کو ملنے والی تمام سبسڈیاں ختم کر دی گئی ہیں۔

جاپان، فرانس، امریکہ حتیٰ کہ چین جیسے ترقی یافتہ ملکوں کے کسانوں کو پیداوار اور ان کی برآمدات بڑھانے کے لئے مختلف شکلوں میں سرکاری سبسڈیاں اور چھوٹیں دی جاتی ہیں۔ بھارت کا کسان ہر سال 84 ملین ٹن چاول اور 70 ملین ٹن گندم کی پیداوار دے رہا ہے جو ملکی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ ساتھ برآمد کرنے کے لئے بھی بچی رہتی ہے۔ عالمی منڈیوں میں بھارتی زرعی اجناس کو اس لئے آسانی سے پذیرائی مل جاتی ہے کیونکہ کسان کو معیاری اور مقداری پیداوار دینے کے لئے مطلوبہ زرعی مداخل سبسڈی پر دستیاب ہوتے ہیں۔

غیر منظم منڈیوں کے باعث آڑھتی لین دین میں کسانوں سے بددیانتی کرتے ہیں، مثلاً آڑھتی وزن کے لئے عموماً دو طرح کے پیمانے (باٹ) استعمال کرتے ہیں یعنی فصل خریدتے وقت زیادہ تول والے باٹ جبکہ بیچتے وقت کم تول کے باٹ استعمال کئے جاتے ہیں جبکہ پیسوں کی ادائیگی میں لیت و لعل سے کام لیتے ہوئے قسطوں میں ادا کرتا ہے۔ دوسری طرف کسان مارکیٹ کی سوجھ بوجھ سے عدم واقفیت کے باعث زرعی اشیاء کی خرید و فروخت میں مالی نقصان اٹھاتے ہیں۔ اس حوالے سے حکومتی مارکیٹ کمیٹیوں کا کردار بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ کمیٹیاں عملاً غیر فعال ہو چکی ہیں اور فریقین کے درمیان معاملات طے کرانے میں مثبت کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ جہاں کہیں ان کمیٹیوں کا وجود ہے وہاں یہ آڑھتیوں کی کاسہ لیسی کا کردار ادا کر رہی ہیں۔

ناقص بنیادی ڈھانچہ زرعی پیداوار کی مارکیٹنگ کی لاگت بڑھا رہا ہے۔ ٹرانسپورٹ کی سہولیات کی عدم دستیابی کے باعث کسانوں کو منڈیوں میں بھیجی جانے والی مجموعی پیداوار پر نقصان ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات خراب سڑکوں کے باعث زرعی مصنوعات بروقت منڈیوں تک پہنچ ہی نہیں پاتیں۔ یہ صورتحال سندھ اور بلوچستان میں زیادہ خراب ہے جہاں کھیت سے منڈی تک سڑکیں پہلے ہی کم ہیں اور موجودہ سڑکوں کی

کی جانب سے طے کی جانے والی سپورٹ پرائس بھی ہے۔ زرعی مصنوعات کی سپورٹ پرائس کا تعین پیداواری لاگت یا پیریٹی اپروچ (Parity Approach) کی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے۔ پیداواری لاگت پر سپورٹ پرائس مقرر کرنے کا سادہ مطلب یہ ہے کہ مزدوری، پانی، ٹیکس، کرائے اور ٹریکٹر جیسے زرعی مداخل پر سپورٹ پرائس کا تعین ہونا جبکہ پیریٹی اپروچ کا مطلب ہے کہ پیداوار کے حساب سے سپورٹ پرائس مقرر کیا جاتا۔

ان دونوں اصولوں میں سے ایک کا انتخاب سپورٹ پرائس مقرر کرنے کے بے شمار مقاصد کی ترجیحی اہمیت پہ ہے۔ اگر ایک مخصوص فصل یا دو یا دو سے زیادہ فصلوں کی ایک ساتھ کاشت پر پیداواری مراعات دینا اہم ہو تو کم مدت کے اندر پیداواری لاگت پر سپورٹ پرائس کا تعین مفید ہے۔ جبکہ منڈی کی قوتوں (مقامی اور بین الاقوامی) کا اثر کم کرنے کے لئے پیریٹی اپروچ کے تحت قیمتوں کا تعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ زرعی مداخل پر سبسڈی کی عدم موجودگی میں کسانوں کے مفاد اور زرعی ترقی کے لئے بہتر یہ ہے کہ زرعی مداخل اور زرعی پیداوار دونوں کی قیمتوں پر سپورٹ پرائس دی جائے یا کم از کم سپورٹ پرائس اتنی ہونی چاہئے کہ وہ زرعی مداخل کی قیمتوں میں اضافے کی سالانہ شرح کے حساب سے کسانوں کو ہونے والے نقصان کی تلافی کرے۔ اس وقت ہو یہ رہا ہے کہ کسان عالمی نرخوں پر زرعی مداخل خریدنے اور مقامی نرخوں پر اپنی پیداوار بیچنے پر مجبور ہیں۔ مثلاً پچھلے سال حکومت نے گنے کی فصل پر سپورٹ پرائس 36 روپے مقرر کی۔ کسانوں کا موقف تھا کہ گنے کے کاشتکاروں کو 36 روپے فی من سپورٹ پرائس دینا ناانصافی ہے کیونکہ ایندھن کے نرخ 60 روپے فی کلوگرام تھے۔ ایگریکلچر پرائس کمیشن کا قیام اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ کسانوں کی مدد کے لئے زرعی اجناس کی قیمتیں تجویز کرے گا جس میں مداخل کی لاگت، مزدوری، پانی اور ٹیکس شامل ہوں گے۔ لیکن بدقسمتی سے حکومت کی نااہلی کے باعث سپورٹ پرائس کا نظام زرعی پیداوار کی مارکیٹنگ میں کسانوں پر الٹ اثرات مرتب کر رہا ہے۔ بڑا ظلم یہ کیا جاتا ہے کہ سپورٹ پرائس کے اعلان میں ہمیشہ دیر کی جاتی ہے جس کا فصلوں کی پیداواریت پر منفی اثر پڑتا ہے اور بالخصوص سندھ کے کسانوں کو زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ سندھ کے کسانوں اور ماہرین زراعت کا کہنا ہے کہ سندھ کی فصل پنجاب کی نسبت ایک ماہ یا 40 دن پہلے تیار ہو جاتی ہے اور سپورٹ پرائس کے اعلان سے پہلے سندھ کی فصل آڑھتیوں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اس طرح حکومتی سپورٹ پرائس کا فائدہ کسانوں کی بجائے آڑھتی کو ہوتا ہے جو فصل کو زیادہ قیمت پر شہری علاقوں میں دوبارہ فروخت کر کے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔

انہی غیر حقیقت پسندانہ سرکاری پالیسیوں، سماجی و معاشی عدم استحکام، غربت اور مواقع کی عدم دستیابی کی وجہ سے کئی کسانوں نے زراعت کو خیرباد کہہ دیا ہے اور یہی وہ حقیقی صورتحال ہے جس کی وجہ سے اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے ایف اے او نے مستقبل قریب میں پاکستان میں خوراک کے شدید بحران کا اندیشہ ظاہر کیا ہے۔ مسائل کے حل کے لیے درج ذیل سطروں میں کچھ سفارشات اس امید کے ساتھ دی جا رہی ہیں کہ حکومت کسان دوست پالیسی مرتب کرتے وقت انہیں مدنظر رکھے گی:

سفارشات اور تجاویز:

- مڈل مین کا مکمل خاتمہ کیا جائے؛
- کسان کی فصلوں کی قیمت ان پٹس کی قیمتوں کے تناسب سے دی جائے؛
- مارکیٹ سے منڈیوں تک سڑکیں تعمیر کی جائیں اور ٹرانسپورٹ مفت فراہم کی جائے؛
- کسانوں کو سرکاری خرچ پر کولڈ سٹوریج بنا کر دیئے جائیں جہاں سبزیاں اور پھل اور دودھ سٹور کیا جا سکے؛
- اجناس کی قیمت طے کرنے اور مارکیٹنگ پالیسی بنانے میں کسانوں کی رائے کو شامل کیا جائے؛
- جنس کی بجائے فصلوں پر امدادی قیمتوں کا تعین کیا جائے اور انہیں عالمی مارکیٹ سے منسلک کیا جائے؛
- منڈی کے اتار چڑھاؤ سے کسانوں کو باخبر رکھا جائے اور فصلوں کی انشورنس کی جائے؛
- مارکیٹ کمیٹیوں کو فعال بنایا جائے اور ان میں غریب کسانوں کے نمائندوں کو نمائندگی دی جائے؛
- آڑھتیوں کے باٹ اور کنڈے ہر ہفتے چیک کئے جائیں اور دھوکہ بازوں کو کڑی سزائیں دی جائیں؛
- چھوٹے کسانوں کے تمام قرضے معاف کر دیئے جائیں اور زرعی ان پٹس پر امدادی قیمت دی جائے؛
- غریب اور چھوٹے کسانوں کو بلاسود قرضے دیئے جائیں؛
- دودھ کی قیمت ملٹی نیشنل کمپنیوں کی بجائے کسانوں کی مشاورت سے طے کی جائے اور گاؤں کی سطح پر کولڈ سٹوریج بنائے جائیں؛
- ایپٹما اور اپسما کے استحصالی ہتھکنڈوں سے کپاس کے کاشتکاروں کو نجات دلائی جائے جبکہ زہریلی ادویات اور کھادوں کی قیمتوں اور کوالٹی میں اعتدال لایا جائے؛
- گنے کے کاشتکاروں اور شوگر ملوں کے مالکان پر مشتمل بااختیار کمیٹیاں ہر ضلع کی سطح پر بنائی جائیں جو کرشنگ شروع کرنے کے علاوہ گنے کی قیمت اور دیگر بنیادی مسائل باہمی مشاورت سے طے کرنے کا قانون وضع کیا جائے۔ اس ضمن میں شوگر مل مالکان کی من مرضی اور اجارہ داری کو فوری طور پر ختم کیا جائے۔

معلوماتی سلسلہ

ترقیاتی عمل اور تعمیرِ استعداد
کمیونٹی موبلائزیشن کیلئے درکار مہارتیں

قسط 3

تحریر: فدا حسین

قارئین کرام گزشتہ شمارہ میں ہم نے کمیونٹی موبلائزیشن کے جن موضوعات پر بات کی تھی اس میں اہم موضوعات، کمیونٹی کو کیسے متحرک کیا جائے؟ کمیونٹی موبلائزیشن کے مراحل اور اس ضمن میں ڈاکٹر فل بارٹل کے کمیونٹی موبلائزیشن سائیکل کے کچھ مراحل شامل تھے ڈاکٹر فل بارٹل کے کیمونٹی موبلائزیشن سائیکل کے بعد کے مراحل آپ کے مطالعہ کے لئے تیسری قسط میں پیش کئے جارہے ہیں۔

9۔ پراجیکٹ کمیٹی کا چناؤ: کمیونٹی کی شراکت سے کمیونٹی کے مسائل کے حل اور پراجیکٹ کی نشاندہی کے بعد پراجیکٹ پر عملدرآمد کا مرحلہ آتا ہے۔ جس کے لئے کمیونٹی میں سے کچھ ذمہ دار افراد کا چناؤ کیا جانا ضروری ہوتا ہے جو اس سارے عمل کی انتظام کاری کی ذمہ داری لے سکیں۔ اس کمیٹی کو پراجیکٹ کمیٹی یا ایگزیکٹو کمیٹی بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کمیٹی کے انتخاب کے لئے مقامی روایات اور ضروریات کو مدنظر رکھا جانا ضروری ہے۔ نیز موبلائزر کا کام یہ ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ یہ کمیٹی تمام لوگوں کی مشاورت سے بنائی گئی ہے۔ نیز کمیٹی کے ممبران کی ذمہ داریوں کی تفصیل تمام لوگوں کے سامنے بیان کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کمیٹی کو پراجیکٹ سائیکل مینجمنٹ اور ریکارڈ رکھنے کی ابتدائی تربیت بھی دی جانی ضروری ہے۔ نیز اس کمیٹی کی استعدادِ کار میں وقت بہ وقت اضافہ کرتے رہنا از حد ضروری ہے۔

10۔ کمیونٹی پراجیکٹ ڈیزائن: انتظام کاری کی تربیت کے ضمن میں مندرجہ ذیل سوالات اٹھائے جاتے ہیں: ہم کیا چاہتے ہیں؟ ہمارے پاس کیا ہے؟ جو کچھ ہمارے پاس ہے اسے کس طرح استعمال کریں کہ جو ہم چاہتے ہیں وہ حاصل ہو جائے۔ نیز جو کچھ عملدرآمد کے دوران ہوگا اس کے نتیجے میں کیا ہوگا؟

کمیونٹی پراجیکٹ ڈیزائن میں ان سوالات کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ ان سوالات کے جوابات خود کمیونٹی میں سے لئے جاتے ہیں جن پر زیادہ سے زیادہ لوگوں کا اتفاق ہوتا ہے۔ اور اس سارے عمل میں موبلائزر کا کردار سہل کاری فراہم کرنا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پراجیکٹ کمیونٹی کی ایسی اجتماعی سرگرمی یا سرگرمیوں کا مجموعہ ہوتا ہے جن کیلئے ترغیب ایک موبلائزر فراہم کرتا ہے اور جن کا فیصلہ کمیونٹی خود کرتی ہے۔ پراجیکٹ ڈیزائن کی ترتیب کچھ اس طرح کی ہوتی ہے۔ کہ مسئلہ کیا ہے؟ مسائل کو مقاصد میں تبدیل کرکے دیکھا جاتا ہے۔ مقاصد کو سمارٹ SMART کے اصولوں پر پرکھا جاتا ہے یعنی:

مخصوص **Specific** قابلِ پیمائش **Measurable** قابلِ حصول **Attainable** حقیقت پر مبنی **Realistic** طے شدہ وقت سے متعلق **Time-bound**

11۔ پراجیکٹ ڈیزائن میں مندرجہ ذیل کا موجود ہونا ضروری ہے: کمیونٹی کی موجودہ صورتحال اور پراجیکٹ پر عملدرآمد کے بعد کمیونٹی کی صورتحال۔ پراجیکٹ ڈیزائن میں وسائل اور مشکلات کی تفصیل بھی دی جاتی ہے۔ وسائل کے حصول کے لئے لائحہ عمل کا تعین کیا جاتا ہے۔ جس میں بتایا جاتا ہے کہ رکاوٹوں کو کس طرح دور کیا جائے گا؟ تاکہ مقاصد حاصل کئے جاسکیں۔ اس سلسلے میں مؤثر ترین لائحہ عمل کا چناؤ کیا جاتا ہے۔ پراجیکٹ کمیٹی اور تنظیمی سٹاف کی ذمہ داریوں کا تعین کیا جاتا ہے کہ کون کیا کرے گا؟ یعنی رپورٹنگ، مانیٹرنگ، وغیرہ۔ لیکن اس سارے عمل کے دوران موبلائزر کو ایک عمومی سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ ان سرگرمیوں کے پاس یہ دیگر وسائل کہاں سے آئیں گے؟

12۔ گفت و شنید اور مذاکرات: بحث و گفتگو کا مرحلہ پراجیکٹ ڈیزائن کی دستاویز کی تیاری کے بعد کا مرحلہ ہے۔ یعنی جب ایک دستاویز بطور پروپوزل کے تیار ہوجاتی ہے اور اس کی بنیاد پر ڈسٹرکٹ گورنمنٹ، صوبائی حکومت، مختلف محکموں یا فنڈرز کے ساتھ بات چیت کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔ اس بنیاد پر سیاسی قائدین اور دیگر مقامی سماجی قیادت کے ذریعے پالیسی سازوں تک کمیونٹی کی حقیقی ضروریات کے بارے میں ایڈووکیسی کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال مسائل کے حل کے لئے چاہے جو بھی ذریعہ اختیار کیا جائے پراجیکٹ ڈیزائن کی صورت میں ایک پراجیکٹ پروپوزل کی دستاویز تیار ہوجاتی ہے جس کی بنا پر گفت و شنید کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔

13۔ ترقیاتی سرگرمیوں کی شروعات: منصوبہ پر کام کے آغاز کے لئے معاہدہ کی دستاویز تیار کرنا اور اس پر دستخط ایک اہم سرگرمی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں موبلائزر کا رول یہ ہوتا ہے کہ وہ پراجیکٹ کمیٹی کے ارکان کو مناسب رہنمائی فراہم کرے تاکہ یہ دستاویز تیار ہوجائے اور پروپوزل کو اس کے ساتھ اپنڈکس کے طور پر منسلک کردیا جائے۔ معاہدہ کے دستخط کنندگان میں اہم سٹیک ہولڈرز کو ضرور شامل کیا جانا چاہئے۔ اگر منصوبہ کے لئے بیرونی وسائل کا تعلق مالی وسائل سے ہو تو پہلے چیک کی وصولی کے موقع پر ایک تقریب کا انعقاد کیا جاسکتا ہے۔ جس میں پراجیکٹ پر عملدرآمد کا باقاعدہ آغاز کیا جاسکتا ہے۔ اس سے کمیونٹی کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ اور پراجیکٹ پر عملدرآمد میں بہتری اور شفافیت بھی ہوگی۔

14۔ مانیٹرنگ اور رپورٹ: منصوبہ پر کام کا آغاز ہونے کے بعد پراجیکٹ کے مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں اور پراجیکٹ کی تکمیل کا مرحلہ آتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ پراجیکٹ کمیٹی کے لئے مانیٹرنگ اور جائزہ کی تربیت بھی کی جاتی ہے تاکہ جاری منصوبے کی مانیٹرنگ کی جاسکے اور اس کے نتائج پر مبنی ایک جامع رپورٹ تیار کی جاسکے۔

15۔ سرگرمیوں کو مقاصد کی تکمیل تک جاری رکھنا: اس دوران جبکہ منصوبے پر کام جاری ہوتا ہے موبلائزر کا کام یہ ہے کہ وہ پراجیکٹ کمیٹی کے تعاون سے اس کی مانیٹرنگ کی سرگرمیاں انجام دینے کے لئے سہل کاری فراہم کرے۔ کمیونٹی کی دلچسپی اور شراکت کو یقینی بنانے کے لئے شفافیت قائم رکھنے میں پراجیکٹ کمیٹی کو مشاورت فراہم کرنا ایک اچھے موبلائزر کا کام ہے تاکہ لوگوں کا اعتماد قائم رہے۔

16۔ سرگرمیوں کی تکمیل پر رسمی تقریب کا انعقاد: منصوبہ پر کام کی تکمیل کے بعد ایک تقریب کا اہتمام کیا جائے اور موبلائزر کے لئے یہ ایک اچھا موقع ہوتا ہے جب وہ کمیونٹی کی حوصلہ افزائی کے ذریعے انہیں پراجیکٹ کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہے اور ترقی کے ایک دوسرے دور کے آغاز کے لئے کمیونٹی کو تیار کرتا ہے۔ اس دوران خود کمیونٹی کے اندر کئی ایسے موبلائزرز کی نشاندہی ہو چکی ہوتی ہے جو آئندہ چل کر کمیونٹی کے دیگر منصوبوں کے لئے اپنی خدمات فراہم کرتے ہیں۔ بعض اوقات ایک کامیابی کے بعد وہ لوگ بھی شامل ہونا پسند کرتے ہیں جو پہلے منصوبہ میں محض ایک تماشائی کی حیثیت رکھتے تھے۔

کمیونٹی موبلائزیشن فریم ورک

کمیونٹی موبلائزیشن فریم ورک دراصل کمیونٹی موبلائزیشن کا ایک اور ماڈل ہے جو مختلف مراحل پر مشتمل ہے اور جس کے ہر مرحلے میں کمیونٹی کی ترقی سے متعلق کچھ سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان سرگرمیوں کی انجام دہی کے لئے ضروری لائحہ عمل کے علاوہ عملدرآمد کے نتیجے میں حاصل ہونے والے ممکنہ نتائج اور ان سرگرمیوں کے لئے درکار وسائل اور معاونت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ ذیل میں ہم کمیونٹی موبلائزیشن فریم ورک کے ہر ایک مرحلے کی تفصیل بیان کررہے ہیں۔ کمیونٹی موبلائزر کو چاہئے کہ وہ فیلڈ ورک کے دوران بتائے گئے مندرجہ ذیل اہم نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے مقامی سماجی، ثقافتی اور سیاسی حالات، مسائل اور ماحول کی مناسبت سے کچھ سرگرمیوں میں ترمیم یا اضافہ کرے۔

پہلا مرحلہ

کمیونٹی میں پہلی دفعہ جانا، اور سرگرمیوں کا آغاز کرنا (Entry/Initiating)			
سرگرمیاں	طریقہ کار/لائحہ عمل	نتائج	درکار معاونت
☆ایک یا زیادہ افراد کمیونٹی کی ضرورت یا ضروریات کو محسوس کرتے ہیں۔ ☆ یہ افراد کمیونٹی کے اہم افراد کی نشاندہی کرتے ہیں (جن میں سے کچھ رسمی اور غیر رسمی لیڈرز ہوسکتے ہیں) اور کچھ علاقوں کا انتخاب کیا جاتا ہے، جن میں کوئی مخصوص کمیونٹی آباد ہو سکتی ہے جس کیلئے سرگرمی کا آغاز کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ مثلاً خواتین، کسان، مزدور، اقلیتیں وغیرہ۔ اس طرح ایک ٹارگٹ کمیونٹی کی تشکیل کے عمل کا آغاز ہوجائے گا۔ اس مرحلہ پر کمیونٹی کے لئے شعور میں اضافے کی سرگرمیوں کا آغاز کردینا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کمیونٹی کو سرگرمیوں میں شریک ہونے کے لئے باقاعدگی سے مدعو کرنا بھی ضروری ہے۔	کمیونٹی کیسے موبلائز ہوتی ہے؟ موبلائزر کے لئے یہ ایک بنیادی سوال ہوتا ہے۔ اس کے لئے لائحہ عمل حسب ذیل ہوگا مقامی قیادت کو قدرتی انداز میں سامنے لانے کے لئے معاونت فراہم کرنا۔ سماجی طور پر مضبوط اور رسمی قیادت کو سرگرمیوں میں شریک کرنا۔ میڈیا کا استعمال کرنا خصوصاً مقامی ریڈیو (ایف ایم) اخبارات، اور دیگر مقامی ذرائع کو استعمال کرنا۔ مؤثر پیغام کے ذریعے کمیونٹی کو متوجہ کرنا اور کمیونٹی کے لئے شعور و آگہی میں اضافہ کے پروگرام شروع کرنا تاکہ تمام کمیونٹی کی شراکت کو یقینی بنایا جاسکے۔	اس مرحلہ پر کمیونٹی کی عملی شرکت کی وجہ سے کچھ نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔ لوگوں کا ایک مخصوص گروپ تشکیل پاتا ہے جسے فوکل گروپ کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ گروپ زیرِ بحث ایشو یا مسئلہ پر کام کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوجاتا ہے۔ یہ گروپ: اپنی مقامی قیادت کی خود نشاندہی کرلیتا ہے۔ کچھ افراد کی صورت میں ایسی نمائندگی تلاش کرنا شروع کردیتا ہے جو تمام کمیونٹی کے خیالات کی ترجمانی کرسکے۔ زیرِ بحث مسئلہ کے حل کے لئے تمام کمیونٹی کی منظوری کے لئے کوشش کرتا ہے۔ مشترکہ ضروریات اور مسائل کی نشاندہی کرتا ہے۔	موبلائزیشن کے نتیجے میں تشکیل پانے والے گروپ کو درج ذیل معاونت درکار ہوتی ہے۔ تکنیکی معاونت: یعنی سرگرمی کا آغاز کیسے کیا جائے؟ کمیونٹی کے اہم اور ضروری افراد کی نشاندہی کیسے کی جائے اور انہیں اس سرگرمی میں کیسے شریک کیا جائے؟ مقامی قیادت کو کیسے سامنے لایا جائے؟ معلوماتی مواد کس طرح کا ہو؟ نیز اس کی ترسیل کے لئے اختیار کئے جانے والے ذرائع کی نوعیت کیا ہو؟ کن موضوعات پر تربیت دی جائے؟ مثلاً ٹیم بلڈنگ، مسئلہ پر تجارتی سیشن وغیرہ

(بقیہ آئندہ شمارے میں)

زرعی تعلیم اور مرد و خواتین کی برابری میں حائل رکاوٹیں

تجربہ و تحقیق: محمد زکریا یوسف حسن، ڈاکٹر خورشید علی اور ڈاکٹر منیر احمد،
شعبہ توسیع: زرعی یونیورسٹی فیصل آباد

پاکستان کی آدھی سے زائد آبادی خواتین پر مشتمل ہے جو اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ معاشرتی اور معاشی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ یہ خواتین نہ صرف صنعتی سرگرمیوں میں مصروف ہیں بلکہ زراعت کے شعبہ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔ فصلات کے کاشتی امور جیسے بیج کی صفائی، گوڈی، سبزیوں کی چنائی، گندم کی کٹائی، کپاس اور چاول کی لاب لگانے کے ساتھ ساتھ جانوروں کی نگہداشت، ان کو پانی پلانا، چارہ ڈالنا، باڑے کی صفائی کرنا اور دودھ دوہنا جیسے عوامل میں بھی ان کا حصہ نمایاں ہے۔ گھر پر رہتے ہوئے وہ تمام گھریلو کام نبھاتی ہیں۔ دیکھا جائے تو وہ تین طرح کے کردار ادا کر رہی ہیں یعنی افزائش نسل، پیداواری اور معاشرتی کام لیکن ان تمام کاموں اور ذمہ داریوں کو نبھانے کے باوجود ملک کا ایک پسماندہ طبقہ ہیں۔ خصوصاً دیہی معاشرہ میں ان کی حالت اور بھی بری ہے۔ گھر یا گھر سے باہر ان کو فیصلے کا اختیار نہیں ہے۔ بلکہ تقریباً تمام تر فیصلے مرد ہی کرتے ہیں اور بے اختیار نہ ہونے کا بڑا سبب ان

کی مردوں پر معاشی انحصاری تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اور عوامل جیسے سیاسی، معاشرتی اور رسوم و رواج ان میں شامل ہیں۔ کوئی بھی معاشرہ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی اپنے آپ کو قائم دائم رکھ سکتا ہے جب تک اس کے تمام افراد کو برابری کی سطح پر وسائل تک رسائی حاصل نہ ہو مگر خواتین کو وسائل تک رسائی سب سے اہم مسئلہ ہے:

- دیہی معاشرہ میں جہاں پہلا وسیلہ زمین ہے اس کے حق سے وہ محروم ہے حالانکہ آئین پاکستان کی رو سے وہ زمین کی وارث، مالک اور خرید و فروخت کے اختیارات رکھتی ہے مگر معاشرتی ماحول میں وہ اس سے علیحدہ تصور کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں معاشرتی طور پر فرمانبردار عورت یا اولاد اس کو سمجھا جاتا ہے جو اپنے باپ، بھائیوں یا شوہروں کے حق میں دستبردار ہو جائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس پر ایسے الزامات عائد کیے جاتے ہیں کہ جن کو سن کر انسان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔
- زمین کو کاشت کرنے کے لئے پیسے کی ضرورت ہے اور آسان اقساط پر قرض کی فراہمی نہ صرف فصلات کی کاشت کو ممکن بناتی ہے بلکہ اس سے مشکل اوقات میں خاندان کو سہارا بھی ملتا ہے۔ چونکہ قرضہ دینے والے ادارے زمین کو ضمانت کے طور پر استعمال کرتے ہیں مگر عورتوں کے نام زمین نہ ہونے کی وجہ سے ایسے ادارے انہیں قرضہ مہیا نہیں کرتے۔ اگر کسی عورت کے نام زمین ہو اور اسے قرضہ مل بھی جائے تو یہ رقم ان کی بجائے ان کے خاوند استعمال کر کے ضائع کر دیتے ہیں۔
- آج بغیر ٹیکنالوجی کے آپ کوئی کام احسن طریقے سے نہیں کر سکتے مگر یہاں بھی مردوں نے ٹیکنالوجیز جس سے ان پر کام کا بوجھ کم ہو اپنے استعمال میں لے آئے ہیں اور عورتیں بیچاری وہی محنتی کام کرنے پر مجبور ہیں۔ ان مسائل کا حل کسی قدر تعلیم یافتہ ہونے میں بھی مضمر ہے مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ عورتیں اس سے محروم ہیں۔ بے شک خواتین میں پچھلے سالوں میں تعلیمی معیار بڑھا ہے مگر ہم پرائمری درجہ سے اعلیٰ تعلیم معیار کی طرف جائیں تو لڑکے لڑکیوں میں فرق بڑھتا جاتا ہے اور کم تعلیم یافتہ خواتین کا تناسب مردوں کے مقابلے میں کافی زیادہ ہو جاتا ہے۔ اسی تعلیم کی کمی کی وجہ سے خواتین پر اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور دیہی معاشرے میں وہ مجبور ہوتی ہیں کہ کھیت مزدوری ہی کریں۔
- زراعت میں خواتین کا کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ زراعت ایک صنعت کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے جہاں روز نت نئی ایجادات روبہ عمل ہیں جن کے لئے تربیت ایک لازمی جز ہے۔ اس تربیت کے لئے حکومت نے ایک خصوصی محکمہ بنایا ہے جس کو "محکمہ زراعت (توسیع)" کہا جاتا ہے۔ اس محکمہ کے ذمہ کاشتکاران کی تعلیم و تربیت ہے جو کہ کھیت اور روز مرہ زندگی گزارنے کے لئے لازمی ہے مگر تمام دنیا کی طرح یہاں بھی خواتین کے حقوق اور ضرورت سے قطعاً صرف نظر کیا گیا ہے سوائے ایک پروگرام کے باقی تمام توسیع پروگراموں میں خواتین کو کلی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حکومت نے تمام زرعی کارکنان مرد حضرات کو تعینات کیا ہوا ہے اور ایک بھی خاتون اس میدان میں نظر نہیں آتی۔ دوسری طرف شوہر حضرات بھی محکمہ کی طرف سے منعقدہ تربیتی پروگراموں میں اپنی بیویوں کو شرکت کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ عام خیال کے مطابق عورتوں کا کام صرف مردوں کو امداد دینا ہے نہ کہ کام کرنا۔

ان تمام مذکورہ مسائل کے حل کے لئے اقوام متحدہ نے 1951ء میں بیجنگ کانفرنس میں ایک نئی حکمت عملی کو اپنایا اور اسے "مرد و زن کی برابری (Gender Mainstreaming)" کا نام دیا گیا ہے۔ جس کے تحت تمام دنیا میں کوششیں شروع کی گئیں کہ عورت و مرد میں توازن پیدا کیا جائے تاکہ دونوں جنس بھرپور طریقے سے اپنی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کر سکیں۔ یہ حکمت عملی اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود ابھی تک قانون سازی کے مرحلے میں ہے مگر دنیا کے کئی ممالک پاکستان سمیت ہر شعبہ زندگی میں اس کو اپنانے کے لئے کوشاں ہیں۔ اوپر بیان کئے گئے حقائق کی روشنی میں سوچا گیا کہ شعبہ توسیع زرعی یونیورسٹی فیصل آباد نے پی ایچ ڈی کے موجودہ مقالہ کے لیے دیہی افراد کے خیالات جاننے چاہئیں۔ اس مقالہ کا عنوان "پنجاب میں زرعی تعلیم و توسیع میں مرد و زن کی برابری میں رکاوٹوں کا تجزیہ کیس سٹڈی برائے ضلع مظفر گڑھ" طے کیا گیا۔ امید کی جاتی ہے کہ اس مقالے کے نتائج کی روشنی میں زرعی تعلیم و توسیع میں تضاد ختم کرنے سے جہاں دیہی خواتین معاشرہ میں بہتر مقام پائیں گی وہیں وہ ملک و قوم کی ترقی کو بھی دوچند کریں گی۔ ضلع مظفر گڑھ چار تحصیلوں پر مشتمل ہے جن میں علی پور، جتوئی، کوٹ ادو اور مظفر گڑھ شامل ہیں۔ ہر تحصیل میں سے پانچ گاؤں رینڈملی منتخب کیے گئے۔ اس طرح کل 20 گاؤں منتخب ہوئے۔ ان گاؤں میں تمام وہ خاندان جو کہ کاشتکاری سے منسلک تھے ان کو جواب دہندگان تصور کیا گیا۔ ہر گاؤں سے 25 کاشتکار خاندان (میاں بیوی) رینڈم سیمپلنگ تکنیک (Random Sampling Techinque) کے تحت منتخب کیے گئے جو کہ ہمارے اس مقالہ کے لئے جواب دہندگان تصور ہوئے۔ اس طرح کل 500 کاشتکار خاندان اور 1,000 جواب دہندگان سے معلومات حاصل کرنے کے لئے ایک سوالنامہ ترتیب دیا گیا۔ معلومات حاصل کرنے کے لئے "سروے" کے طریقہ کو اپنایا گیا اور ایک ٹیم بنائی گئی جو کہ ہر گاؤں کے لئے ایک مرد اور خاتون پر مشتمل تھی۔ جب تمام جواب دہندگان سے معلومات اکٹھی کر لی گئیں تو سوالناموں کو گہری تحقیق سے جانچا اور پرکھا گیا اور 900 جواب دہندگان کو درست تسلیم کیا گیا اور 98 مسترد کر دیئے گئے۔ چونکہ محکمہ زراعت (توسیع) اور سول سوسائٹی کے ارکان بھی اس تعلیمی پروگرام کا حصہ ہیں، اس لئے محکمہ زراعت (توسیع) کے افسران، ڈپٹی ڈسٹرکٹ افسران، ڈسٹرکٹ افسر اور ایگزیکٹو ڈسٹرکٹ افسر بمعہ ایک این۔ جی۔ او کے تمام ممبران (مرد و خواتین) کو بھی جواب دہندگان تصور کرتے ہوئے ان سے بھی علیحدہ علیحدہ سوالنامہ کے تحت معلومات اکٹھی کی گئیں۔ ان تمام معلومات اور جوابات کی جانچ پڑتال کمپیوٹر پروگرام "ایس۔ پی۔ ایس۔ ایس" پر مختلف شماریاتی تراکیب استعمال کرتے ہوئے کی گئیں۔ اس تحقیق کے جو نتائج سامنے آئے ہیں ان کے مطابق:

- شوہروں کی اوسط 41.6 سال اور بیویوں کی عمر 35.5 سال تھی اکثریت (64.3 اور 77.4%) خاوند اور بیوی جواب دہندہ بالترتیب ناخواندہ تھے۔ خاوند جواب دہندہ معاشرتی طبقات میں ناظم، کونسلر، مزدور کونسل نمبردار اور کسی سیاسی پارٹی کے ممبر جیسے عہدوں پر فائز پائے گئے جبکہ اس کے مقابلے میں صرف 01.% بیوی جواب دہندہ خاتون کونسلر کے عہدہ پر کام کر رہی تھیں۔ میاں بیوی دہندگان پوری تندہی کے ساتھ فصل کے کاشتی امور میں ملوث پائے گئے ماسوائے ٹریکٹر سے کھیت کی تیاری، کھاد کا کھیتوں میں بکھیرنا، گندم کی تھریشنگ اور پھلوں کی پیکنگ میں جہاں بیویوں کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ یہی صورت حال جانوروں کی نگہداشت میں بھی دیکھنے کو ملی جہاں خاوند جواب دہندگان کا کردار پلے بھاری پڑنے میں مضمر تھا۔
- دیکھنے میں آیا کہ مختلف ذرائع ابلاغ سے خواتین کم استفادہ کر رہی تھیں جس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ ان کو ملازمت کے مواقع کم میسر تھے جس سے ان کی گھر اور معاشرے میں حیثیت کم ہو گئی تھی۔ محکمہ زراعت (توسیع) نے بھی ان خواتین کو نظر انداز کیا ہوا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ محکمہ ہذا میں تمام توسیعی کارکن مرد ہیں۔ یہ توسیعی کارکن معاشرتی، رسم و رواج اور مذہبی وجوہات کی بنا پر خواتین کسانوں سے رابطہ نہیں رکھ سکتے۔ جس کے نتیجے میں توسیع تعلیم اور مرد و زن کے درمیان ایک گہری خلیج حائل ہو گئی ہے البتہ ایک امید کی کرن پھوٹی ہے کہ والدین نے کم از کم اپنے بچوں اور بچیوں کے درمیان خوراک کا تفاوت ختم کر دیا ہے۔
- خواتین جواب دہندگان نے ملازمت کے حصول میں حائل مشکلات میں خواتین کے غیر اجرتی کاموں کو کارآمد سمجھنے کے فقدان اور کم اجرتی اور نچلے درجے کے کاموں کو اول اور دوئم درجہ کی اہمیت دی تھی۔ فیصلہ سازی میں خواتین جواب دہندگان نے سب سے بڑی رکاوٹ کا سبب خاندانی دباؤ کو بیان کیا جبکہ زمین کی ملکیت بارے خاوند جواب دہندگان نے کہا کہ اگر خواتین کو یہ حق دے دیا گیا تو وہ معاشی طور پر آزاد ہو جائیں گی اور پھر ہماری بات نہیں مانیں گی۔
- خواتین زرعی کارکنان کی تعیناتی کے مسئلہ میں خاوند اور بیوی جواب دہندگان کی آراء میں تضاد پایا گیا۔ البتہ زرعی تعلیم و توسیع میں مرد و زن کی برابری میں عورتوں کا خون کے رشتوں کے علاوہ غیر مردوں سے ملنا، معاشی و معاشرتی تحفظ کا فقدان، غیر موثر سیاسی طاقت، غیر مناسب سفر اور وسیلہ سفر کی سہولیات خواتین زرعی کارکنان کے رہائشی مسائل اور مردانہ تا کو عورتوں کی ترقی کی راہ میں حائل مانا گیا۔

ان سب نتائج کی روشنی میں حکومت پاکستان کو سفارش کی جاتی ہے کہ:

1- عمومی طور پر ملک اور خصوصی طور پر علاقہ ہذا میں خواتین کو ان کے حقوق سے آگاہ کرنے کے لئے خصوصی مہم شروع کی جائے؛

2- اسی طرح حکومت پنجاب سے سفارش کی جاتی ہے کہ نہ صرف موجودہ محکمہ توسیع کی تنخواہ اور مراعات کو بہتر کیا جائے بلکہ ضلع کی سطح پر خواتین کسانوں کی تربیت کے لئے خواتین کا علیحدہ ونگ بنایا جائے؛

3- دور اخواتین کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لئے ووکیشنل اداروں کی تعداد بڑھائی جائے اور وہاں ایسے ہنر سکھائے جائیں جو بدلتی ہوئی دنیا کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت اور اہلیت رکھتے ہوں۔

آخر میں علاقے کے لوگوں کے لئے سفارش کی جاتی ہے کہ علاقے کے سرکردہ لوگ آگے بڑھیں اور معاشرے کی غلط اقدار کو تبدیل کرنے کے لیے اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کریں۔ تاکہ عمومی طور پر پورا ملک اور خصوصی طور پر دیہی معاشرہ جو کہ اکثریت میں ہیں کو زندگی گزارنے کے بہتر مواقع ملیں بالخصوص زرعی و توسیع کے توسط سے بہتر پیداوار حاصل کرتے ہوئے دیہی مرد و زن اپنا معیار زندگی بلند کر سکیں۔

بشکریہ: ڈیلی ایکسپریس (12 اپریل 2008ء)

بھٹہ مزدور عورتیں بدترین استحصال کا شکار

رپورٹ: یاسمین فرخ ..... نیا گھر تعمیر کرنا ہو یا پرانے گھر کی تزئین و مرمت، کثیر منزلہ کمرشل بلڈنگ تعمیر کرنی ہو یا سرکاری دفتر، ہر قسم کی تعمیر میں ہمیں اس کی بنیادی اکائی یعنی اینٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہوشربا مہنگائی کے اس دور میں ہر چیز گراں قیمت ہو گئی ہے۔ ہم نے کبھی یہ نہ سوچا ہوگا کہ مارکیٹ میں ہمیں جس قیمت پر اینٹیں دستیاب ہیں، انہیں اس قیمت پر بنانے کے لئے معاشرے کا ایک طبقہ شدید استحصال کا شکار ہے جسے نہ تعلیم میسر ہے نہ صحت کی سہولیات۔ غلامی کے جال میں جکڑے ہوئے ان لوگوں کا کام بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ہم جیسے معزز شہریوں کے لئے سستے داموں اینٹیں تیار کرنا ہے۔ اگر ہم ان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیں تو ہمیں معاشرے کے اس طبقہ کی مظلومیت اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا اندازہ ہوگا۔ ان میں سب سے زیادہ مظلوم عورت ہے جو بچپن سے لے کر جوانی اور بڑھاپے تک استحصال کا شکار رہتی ہے۔ ان کی اکثریت جبری مشقت کرتی ہے، جسمانی و جنسی تشدد کا شکار ہوتی ہے اور ڈھیروں بچے پیدا کرتی ہے۔ یہ عورتیں بھٹوں پر ہی آنکھ کھولتی ہیں اور یہیں سے لحد میں جا اترتی ہیں۔ ان میں سے 70 فیصد عورتیں ٹی بی جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوتی ہیں اور بالآخر موت کے منہ میں چلی جاتی ہیں، جہاں شاید وہ پیدا ہونے کے بعد پہلی بار سکھ کی ابدی نیند سوتی ہیں، ورنہ زندگی کے تپتے صحرا میں تو ان کو اپنے پاؤں کے آبلے دیکھنے تک کی مہلت نہیں دی جاتی۔

بھٹہ مزدوروں کی زندگی کا موازنہ تہذیب کے آغاز کے ایسے دور سے کیا جا سکتا ہے جب غلاموں کی تجارت عام تھی اور ایک غلام ساری عمر غلام ہی رہتا تھا اور کئی کئی ہاتھوں بکتا چلا جاتا تھا۔ آج کے جدید ترین دور میں بھٹہ پر غلامی کی یہ صورت بدستور موجود ہے۔ بھٹہ پر پیدا ہونے والی بچی یا بچہ تاعمر غلام رہتے ہیں، بھٹہ پر ہی عمر گزارتے ہیں اور یہیں اپنے باپ دادا کا قرض چکاتے ہوئے مٹی میں اتر جاتے ہیں، تبھی ان کی خلاصی ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بھٹہ مزدور عورت کی زندگی جہنم سے بھی بدتر ہے جو اپنے خاوند کے ساتھ مل کر جبری اور سخت مشقت کرتی ہے۔ دوران حمل کئی بھٹہ مزدور عورتیں طبی سہولیات کی عدم دستیابی کے باعث موت کا شکار ہو چکی ہیں اور کئی ایسے کیس اخبارات میں بھی رپورٹ ہو چکے ہیں۔ بھٹہ پر کام کرنے والی عورتیں اور بچیاں بھٹہ مالک یا منشی کے جنسی تشدد کا شکار ہوئیں لیکن انصاف تک رسائی حاصل نہ کر سکیں۔

سرگودھا کے نواح میں بھٹہ پر کام کرنے والی 35 سالہ نسرین تقریباً 29 سال سے بھٹہ پر کام کر رہی ہے۔ اس کے چھ بچے ہیں۔ سیاہ رنگت اور چہرے پر ابھری زرد ہڈیاں بڑی نمایاں ہیں۔ میرے کئی سوالوں کو اس نے ٹال دیا اور اینٹیں ترتیب سے لگاتی رہی۔ بار بار سوال کرنے پر اس نے کہا: "بی بی کیوں میری دشمن بنی ہو۔ مالک نے مجھے تم سے باتیں کرتے دیکھ لیا تو ظلم ہو جائے گا"۔ اس کی 12 سالہ بیٹی نے بتایا "میں، میری امی، ابا اور چھ بہن بھائی سارے دن میں دو ہزار اینٹیں بناتے ہیں اور ہمیں 60 روپے ملتے ہیں"۔ بچی نے بتایا کہ وہ بہت چھوٹی تھی جب سے وہ کام کر رہی ہے۔ رائیونڈ کے نواح میں بھٹہ پر کام کرنے والی اکبری بی بی زوجہ طالب حسین نے بتایا کہ اس کی تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ اس کی عمر لگ بھگ 45 سال ہے۔ اس کا سارا خاندان 36 برسوں سے مختلف بھٹوں پر کام کر رہا ہے۔ اس نے بتایا "ہمیں ایک ہزار اینٹ تیار کرنے کے 170 روپے ملتے ہیں لیکن ہم پانچ لوگ نماز فجر سے مغرب تک زیادہ سے زیادہ سات سو اینٹیں بناتے ہیں، جن کے ہمیں 120 یا 130 روپے ملتے ہیں جن میں سے بھٹہ مالک پیشگی بھی کاٹ لیتا ہے اور بجلی کے بل کے پیسے بھی۔ یوں ہمارے ہاتھ 60 یا 70 روپے آتے ہیں"۔ اکبری بی بی اور اس کی بچیوں کی جلد بری طرح جھلسی ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے پیدا ہونے کے بعد اب تک زندگی میں کبھی آرام یا سکون نہیں دیکھا۔ اس کی زندگی کے دن رات بھٹے پر مشقت کرتے گزرتے ہیں۔ جب اس کا خاوند بیمار ہوتا ہے تو اس کے حصے کی مشقت بھی اس کو ہی کرنا پڑتی ہے اور اگر بھٹہ مالک کی منشا کے مطابق اینٹیں نہ بن سکیں تو ایک دھیلا بھی نہیں ملتا۔ چونگی کی رہنے والی رشیدہ بی بی نے بتایا "مجھے یاد بھی نہیں کہ میں کب سے یہاں پر ہوں، لگتا ہے کہ پیدا ہی یہیں ہوئی تھی۔ باپ کا قرض چکانے کیلئے کام شروع کیا اور اب خاوند کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔ کبھی جب کام کر کے جسم بہت تھک جاتا ہے اور کام کرنے کو دل نہیں چاہتا تو میرا خاوند مجھے افیون کھلا دیتا ہے۔ اب مجھے افیون کی عادت ہو گئی ہے"۔ اسی بھٹے پر کام کرتے ہوئے گلنار کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ وہ اپنے دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ یہاں کام کرتی ہے۔ وہاں کی ایک مزدور عورت نور خشاں نے بتایا کہ بیچاری گلنار منشی کے ہاتھوں کئی بار جنسی تشدد کا شکار ہو چکی ہے۔ ایک بار اس نے تھانے جا کر لب کشائی کی تو تھانے والوں نے بھی اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور منشی کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے گلنار کو انصاف کی دہلیز تک پہنچنے ہی نہ دیا۔ نور خشاں نے کہا "جوان لڑکیوں کی عزت و آبرو کو یہاں کوئی تحفظ حاصل نہیں"۔ اس نے مزید کہا "مانگا منڈی میں بھٹہ مالک ہماری رشتے دار مزدور لڑکی کو آٹھ روز تک جنسی تشدد کا نشانہ بناتا رہا۔ اس کے بعد لڑکی لاپتہ ہو گئی اور اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا"۔

ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں بھٹہ پر کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد تقریباً 18 سے 20 لاکھ کے درمیان ہے۔ صرف لاہور کے ایک زون میں 37 بھٹوں پر کم سے کم 50 اور زیادہ سے زیادہ 200 خاندان کام کرتے ہیں۔ ہر خاندان اوسطاً چھ افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ یوں ایک بھٹے پر کام کرنے والوں کی تعداد 500 سے 600 ہے۔ جن میں نصف عورتیں ہیں جو بدترین استحصال اور غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ایسی مزدوری، جبری مشقت کے زمرے میں آتی ہے جسے عالمی اور ملکی قوانین بھی غیرانسانی و غیرقانونی قرار دے چکے ہیں۔ ایک غیرسرکاری سروے کے مطابق پاکستان میں 16,000 بھٹے ہیں جن میں سے صرف 20 فیصد رجسٹرڈ ہیں۔ چونکہ باقی 80 فیصد رجسٹرڈ نہیں اس لئے مزدور اپنے حقوق سے محروم ہیں۔ ان تمام اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان میں آٹھ لاکھ خواتین اس استحصال کا شکار ہیں، جو انہیں خوراک، صحت اور بنیادی انسانی حق سے یکسر محروم کر رہا ہے۔ وہ پیدائشی غلام ہیں اور بے آواز ہیں کیونکہ وہ اپنے حقوق سے بے بہرہ ہیں۔ اگرچہ کچھ سماجی تنظیمیں ان کے مسائل پر آواز اٹھاتی ہیں لیکن یہ آواز عورتوں کے دیگر مسائل تلے دب گئی ہے۔ حکومت پاکستان کا 1992 کا جبری مشقت کا قانون نافذ تو کیا گیا مگر اس پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ ضروری ہے کہ بھٹہ مزدوروں کے عمومی مسائل کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ ان عورتوں کی طرف بھی خصوصی توجہ دی جائے۔ ان کی آواز کو عورتوں کے دیگر مسائل کے ساتھ اٹھایا جائے۔ حکومتی سطح پر بھی بھٹہ مزدوروں اور بالخصوص عورتوں کی حالت سدھارنے کے لئے ٹھوس حکمت عملی وضع کی جائے۔ بنیادی انسانی ضروریات کی فراہمی بہر حال حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس سلسلے میں سماجی تنظیمیں مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ بھٹہ مزدور عورتوں کے مسائل کو آٹھ لاکھ ماؤں کے مسائل سمجھ کر اٹھایا جائے اور ان کے ساتھ ہونے والی مسلسل زیادتیوں اور ناانصافیوں کا ازالہ کیا جائے۔ ان کے لئے ایسا معاوضہ مقرر کیا جانا چاہئے جس سے وہ اپنے حالات بہتر کر سکیں اور ان کے بچے تعلیم بھی حاصل کر سکیں۔ حکومت صرف معاوضہ ہی مقرر نہ کرے بلکہ اس معاوضہ کی ادائیگی کو بھی یقینی بنانے کے اقدامات کرے۔ مقننہ میں موجود خواتین کی بڑی تعداد ان عورتوں کے مسائل کے حل میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ بھٹہ مزدور عورتیں تو نہیں جانتیں کہ ان کے مسائل کون حل کر سکتا ہے لیکن متعلقہ افراد کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہونا چاہئے۔

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

لاہور ہائی کورٹ کے حکم پر پولیس اور عدالتی حلف نے شیخوپورہ میں چھاپہ مار کے 316 بھٹہ مزدوروں کو بازیاب کروایا جن سے مبینہ طور پر جبری مشقت لی جا رہی تھی۔ بازیاب ہونے والے بھٹہ مزدوروں میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں جو تمام کے تمام عیسائی ہیں۔ ہائی کورٹ نے یہ کارروائی مختلف 14 آئینی درخواستوں کی سماعت کے بعد کی۔ جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا تھا کہ بیگار یا جبری مشقت آئین میں درج بنیادی حقوق کی کھلی خلاف ورزی ہے۔

عدالت نے 9 مختلف حلف تشکیل دیئے جنہوں نے شیخوپورہ پولیس کی مختلف ٹیموں کو ساتھ لیکر سیلانی، گجری، بھدرہ، چنگڑ محلہ اور دوسرے علاقوں میں ساری رات چھاپے مارے اور افراد کو رہا کروا کر انہیں لاہور ہائی کورٹ کے الگ الگ ججوں، جسٹس عظمت سعید، جسٹس شبیر رضا، جسٹس ایم بلاول خان اور جسٹس ایم اے شاہد صدیقی کے روبرو پیش کیا گیا۔ جہاں بھٹہ مزدوروں نے بتایا کہ ان سے انسانیت سوز سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ایک مزدور نے عدالت کو بتایا کہ انہیں روزانہ ڈیڑھ سو روپے فی کس اجرت دی جاتی ہے اور اس کے عوض ہر مزدور کو دو ہزار اینٹیں بنانا ہوتی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اس دوران انہیں تشدد کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے اور وہ اپنی مرضی سے یہ کام چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ ہائی کورٹ نے تمام بھٹہ مزدوروں کو کہا کہ وہ آزاد شہری ہیں اور اپنی مرضی سے جہاں چاہیں جا سکتے ہیں اور جو چاہے کام کر سکتے ہیں کسی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ ان سے جبری مشقت لے۔

مفت قانونی مدد دینے والے ایک غیر سرکاری مرکز، لیگل ایڈ سینٹر کے ڈائریکٹر جوزف فرانسس نے اس موقع پر کہا کہ پاکستان کے دیہی اور پسماندہ علاقوں میں جبری مشقت لی جاتی ہے اور پنجاب میں جبری مشقت کے نشانہ بننے والوں کی بڑی تعداد عیسائی ہے۔

بشکریہ: علی سلمان، بی بی سی اردو ڈاٹ کام لاہور (15-06-2005)

رپورٹ: ڈاکٹر حیدر، ڈائریکٹر گرین رورل ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (جی آر ڈی او)

بھٹہ مزدوروں نے 3 جون 2008ء کو ڈسٹرکٹ سیشن جج سے 4 بھٹہ مالکان کے قبضے سے 57 مزدوروں کو بازیاب کروانے کی درخواست دی۔ جج نے 4 جون کو پولیس کو آرڈر دیا کہ علاقے میں موجود بھٹوں پر چھاپا مار کر مزدوروں کو بازیاب کروایا جائے۔ عدالتی حکم پر عمل درآمد کرتے ہوئے پولیس نے بھٹوں پر چھاپا مار کر مزدوروں کو بازیاب کروایا اور انہیں عدالت میں پیش کیا۔ مزدوروں نے بتایا کہ ان کے ساتھ نہایت ہی انسانیت سوز سلوک کیا جاتا تھا۔ عدالت نے مزدوروں کو جبری مشقت سے آزاد کرتے ہوئے بھٹہ مالکان کو فوری طور پر زیر حراست لینے کا آرڈر دیا۔ پولیس کے ساتھ اس چھاپے کے دوران جی آر ڈی او کے رضا کار، ایڈووکیٹ شہزاد و سلیم ناچیو اور بہت سے دیگر افراد بھی شامل تھے۔ جی آر ڈی او نے ان مزدوروں کو عارضی طور پر حیدر آباد کے قریب ایک گاؤں آزاد نگر میں رکھا۔ بازیاب ہونے والے مزدوروں کی عمر 50 سال سے 6 سال تک تھی جس میں بچے، بڑے اور عورتیں شامل تھیں۔